عظمتِ صوم

حدیثِ قدسی فَاِنَّہٗ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد

روزہ کے بارے میں حدیثِ قدسی کے مندرجہ بالا الفاظ متفق علیہ ہیں، یعنی صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں موجود ہیں:

۱۔ صحیح بخاری کی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں:

"وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ کُلُّ عَمَلِ ابْنِ اٰدَمَ لَہٗ اِلَّا الصِّیَامَ فَاِنَّہٗ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ ....."

۲۔ صحیح بخاری کی ایک دوسری روایت میں حسبِ ذیل الفاظ وارد ہوئے ہیں:

"یَتْرُکُ طَعَامَہٗ وَشَرَابَہٗ وَشَھْوَتَہٗ مِنْ اَجْلِیْ اَلصِّیَامُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ ....."

۳۔ صحیح مسلم کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:

"کُلُّ عَمَلِ ابْنِ اٰدَمَ یُضَاعَفُ: اَلْحَسَنَۃُ بِعَشْرِ اَمْثَالِھَا اِلٰی سَبْعِمِائَۃِ ضِعْفٍ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی "اِلَّا الصَّوْمَ فَاِنَّہٗ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ، یَدَعُ شَھْوَتَہٗ وَطَعَامَہٗ مِنْ اَجْلِیْ ....."

(بحوالہ 'ریاض الصالحین' للامام النّووی)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الصوم لی

جملہ عبادات اسلامی ——— صلوٰۃ و زکوٰۃ اور صوم و حج ——— میں سے عبادتِ صوم کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس کے بارے میں متعدد روایات کی رُو سے جن میں بخاری اور مُسلم کی متفق علیہ روایت بھی شامل ہے، ایک حدیثِ قدسی میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں کہ :

اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ

روزہ خاص میرے لیے ہے اور میں خود ہی اس کی جزا دوں گا

جنہیں بعض لوگوں نے اعراب کے ذرا سے فرق کے ساتھ یوں بھی پڑھا ہے کہ :

اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اُجْزٰی بِہٖ

روزہ خاص میرے لیے ہے اور میں خود ہی اس کی جزا ہوں!

یہاں فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا نماز خدا کے لیے نہیں ؟ اسی طرح کیا زکوٰۃ اور حج اللہ کے سوا کسی اور کے لیے ہیں ؟ ظاہر ہے کہ ان سوالوں کا جواب صرف نفی ہی میں دیا جا سکتا ہے۔ قرآن حکیم کے واضح ارشادات ہیں :

۱۔ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ (طٰہٰ : ۱۴)	اور قائم کر نماز میری یاد کے لیے!
۲۔ حَافِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوۃِ الْوُسْطٰی وَقُوْمُوْا لِلّٰہِ قَانِتِیْنَ۔ (البقرۃ : ۲۳۸)	محافظت کرو نمازوں کی۔ اور خاص طور پر نمازِ وسطیٰ کی اور کھڑے رہو اللہ کے لیے پوری فرمانبرداری کے ساتھ!
۳۔ وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ	اور لوگوں کے ذمے ہے اللہ کے لیے

مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا (آلِ عمران: ۹۷)	حجِّ بیت اللہ۔ جو کوئی بھی استطاعت رکھتا ہو اس کے سفر کی
۴- وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ (البقرۃ: ۱۹۶)	اور پورا کرو حج اور عمرے کو اللہ کے لیے۔
۵- اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَّلَا شُكُوْرًا۔ (الدھر: ۹)	ہم کھانا کھلاتے ہیں تمہیں صرف اللہ کی رضاجوئی کے لیے، اور تم سے طالب ہیں نہ کسی جزا کے نہ شکر یے کے!

اس اشکال کا ایک سطحی سا حل بعض حضرات نے اس طرح کرنے کی کوشش کی ہے کہ روزے میں ریا ممکن نہیں ہے جب کہ بقیہ تمام عبادتوں میں ریاء کا امکان ہے' اس لیے کہ روزے کی کوئی ظاہری صورت نہیں ہے جو لوگوں کو نظر آ سکے بلکہ وہ ایک راز ہے عبد اور معبود کے مابین۔ ظاہر ہے کہ یہ توجیہہ بالکل بے بنیاد ہے اس لیے کہ نماز میں ریا یہی تو ہے کہ پڑھے تو انسان نماز ہی لیکن خالصتًہ لوجہ اللہ نہ پڑھے بلکہ اس میں لوگوں کو دکھانے کی نیّت شامل ہو جائے بعینہٖ یہی معاملہ روزے کے ساتھ بھی ممکن ہے —— رہی دوسری انتہائی صورت کہ انسان روزے سے نہ ہو اور لوگوں سے کہے کہ میں روزہ سے ہوں تو یہ ریا نہیں دھوکا اور فریب ہے اور اس کے مقابل کی صورت نماز کے معاملے میں یہ ہو گی کہ کوئی ظاہرًا تو نماز کے لیے دست بستہ کھڑا ہو جائے لیکن بجائے سورۃ فاتحہ کے کوئی عشقیہ اشعار شروع کر دے۔ یا نعوذ باللہ من ذالک، خدًا اور رسولؐ کو گالیاں دینا شروع کر دے! —— پھر ایک نصِّ قطعی کے طور پر موجود ہے وہ حدیث بھی جس کی رُو سے آنحضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

مَنْ صَلّٰى يُرَائِيْ فَقَدْ اَشْرَكَ	جس نے نماز پڑھی دکھاوے کے لیے وہ شرک
وَمَنْ صَامَ يُرَائِيْ فَقَدْ اَشْرَكَ	کر چکا، اور جس نے روزہ رکھا دکھاوے کے لیے

وَمَنْ تَصَدَّقَ يُرَائِيْ فَقَدْ اَشْرَكَ (رواہ احمد۔ مشکوٰۃ باب الریاء والسمعۃ)

وہ شرک کر چکا اور جس نے خیرات دی دکھاوے کی غرض سے وہ بھی شرک میں مُلوّث ہو چکا!

اِس حدیثِ قدسی کا یہی وہ اشکال ہے جس کے باعث یہ عام واعظین کے مواعظ میں تو بیان ہو جاتی ہے لیکن اسلام کے جدید مُفکّرین کی تحریر و تقریر میں بار نہیں پاتی۔ اِس لیے کہ واقعہ یہی ہے کہ دین کے بہت سے دوسرے لطیف تر حقائق جیسے عہدِ الست، وَحی، الہام، کشف اور رُویائے صادقہ وغیرہ کی طرح اس حدیثِ قدسی کی حقیقت بھی ان لوگوں پر منکشف نہیں ہو سکتی جو دورِ حاضر کے مادّہ پرستانہ اور عقلیّت پسندانہ رُجحانات کے زیرِ اثر رُوحِ انسانی کے جسدِ خاکی سے علیحدہ مستقل وجود اور جُداگانہ تشخّص اور اُس کے ذاتِ باری کے ساتھ خصُوصی ربط و تعلّق کے یا تو سرے سے قائل ہی نہیں ہیں یا کسی درجے میں ہیں بھی تو اُس کے اعتراف و اعلان میں جھجک اور حجاب محسوس کرتے ہیں! — بقول اکبرؔ الٰہ آبادی:

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبرؔ نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

اِس لیے کہ اِس حدیثِ قدسی کی واحد ممکن توجیہہ یہ ہے کہ روزہ رُوح کے تغذیہ و تقویت کا ذریعہ ہے جسے ایک تعلّقِ خاص اور نسبتِ خصُوصی حاصل ہے ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ لہٰذا یہ گویا خاص اللہ کے لیے ہے جس کی جزا وہ بطورِ خاص دے گا۔ یا یوں کہہ لیں کہ چونکہ اُس کا حاصل ہے تقرّب الی اللہ تو گویا اللہ خود ہی بنفسِ نفیس اُس کی جزا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ 'ارواحِ انسانی' کا ایجاد و ابداع 'اجساد' کی تخلیق سے بہت پہلے "جُنُوْدٌ مُّجَنَّدَۃٌ" (مُسلم عن ابی ہریرہؓ) کی صورت میں ہوا۔ اور حضرت آدم علیہ السلام کی عالمِ اجساد میں تخلیق سے بہت قبل خود اُن کی اور اُن سے لے کر تا قیامِ قیامت پیدا ہونے والے تمام انسانوں کی اَرواح مستقل جُداگانہ تشخّص اور پُورے شعورِ ذات اور فیمابین جُملہ امتیازات کے ساتھ موجود تھیں۔

اِس حقیقت کے اِدراک وشعور کے بغیر، واقعہ یہ ہے کہ عہدِ الست کا وہ اہم واقعہ جسے قرآنِ مجید نے بڑے اہتمام اور شدّومدّ کے ساتھ بیان کیا ہے اور جسے مُحاسبۂ اُخروی کے ضمن میں ایک اَہم حجّت قرار دیا ہے یا تو محض تمثیل و استعارہ قرار پاتا ہے یا پھر اُس کے بارے میں اچھے اچھے مُصنفّین کے قلم سے بھی نادانستہ انتہائی لغو اور مہمل جملے نکل جاتے ہیں[1] سیدھی سی بات یہ ہے کہ یہ عہد اجسادِ انسانی کی تخلیق سے قبل عالمِ ارواح میں اَرواحِ انسانی نے پوُرے ہوش اور شعور کے ساتھ کیا اور میدانِ حشر میں جب تمام نسلِ انسانی دوبارہ[2] "جُنُودٌ مُجَنَّدَة" کی صورت میں اپنے خالق کے سامنے پیش ہوگی تو یہی عہدِ الست اُن کے خلاف حُجّتِ اُولیٰ کے طور پر پیش ہوگا! (مبادا تم کہنے لگو قیامت کے دن کہ ہم کو اِس کی خبر ہی نہ تھی یا یوُں کہنے لگو کہ اصل میں تو شرک کا ارتکاب کیا تھا ہم سے بہت پہلے ہمارے آباؤ اجداد نے اور ہم تو بعد میں اُن کی نسل میں پیدا ہوئے تھے!" سورۂ اعراف آیات ۱۷۲،۱۷۳)

اسی طرح اس حقیقت کو جانے اور مانے بغیر کوئی توجیہہ ممکن نہیں اِن متعدد احادیث کی جن سے واضح ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ صرف یہ کہ خلق کے اعتبار سے سب پر مُقدّم ہیں بلکہ آپؐ اس وقت بھی نبی تھے جب کہ ابھی جسدِ آدمؑ تخلیق و تسویہ کے مراحل سے گزر رہا تھا ——— اِس سلسلے میں اِس روایت سے قطعِ نظر جس میں "اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ نُوْرِیْ"

---

[1] مثلاً مولانا امین احسن اصلاحی فرماتے ہیں: "یہ اقرار انسان کے وجود میں آنے سے پہلے ہی عالمِ غیب میں خدا نے اس سے لیا ہے۔" (تدبّرِ قرآن جلد سوم صفحہ ۳۹۴)

[2] وَعُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا ؕ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؗ بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا۔ (الکہف: ۴۸)

اور وہ پیش کیے جائیں گے اپنے رب کے سامنے صف در صف، تب وہ فرمائے گا کہ آپہنچے ہو تم ہمارے پاس بالکل اسی طرح جس طرح ہم نے پیدا فرمایا تھا تمہیں پہلی بار، لیکن تم تو اس مغالطے میں مبتلا ہو گئے تھے کہ ہم تمہارے لیے اس ملاقاتِ موعودہ کے لیے کوئی وقت نہ متعین کریں گے!

کے الفاظ وارد ہوئے ہیں اس لیے کہ وہ مُحدّثینِ کرام کے نزدیک مستند نہیں ہے، آخر اس حدیث کی کیا توجیہہ ممکن ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

عَنْ ابی ھریرۃؓ قَالَ: "قَالُوا يَارَسُوْلَ اللهِ! مَتٰى وَجَبَتْ لَكَ النُّبُوَّةُ؟ قَالَ: "وَآدَمُ بَيْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ!"
(رواہ الترمذی وقال ہذا حدیثٌ حسنٌ)

ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ صحابہؓ نے دریافت کیا یارسُول اللہ آپؐ کو نبوّت کب ملی؟ فرمایا اس وقت جبکہ آدم علیہ السلام ابھی روح اور جسم کے درمیان تھے (یعنی ان میں روح نہیں پھونکی گئی تھی)! ترمذی بحوالہ ترجمان السنۃ اوّل

ظاہر ہے کہ اس کی ایک ہی توجیہہ ممکن ہے اور وہ یہ کہ اجسادِ انسانی کی تخلیق سے بہت قبل ارواحِ انسانی خلعتِ وجود سے مُشرّف ہو چکی تھیں اور اُن کے مابین مراتب و مناصب کے جُملہ امتیازات بھی موجود تھے۔!

بعدازاں جیسے ہی آدم کے جسدِ خاکی کا ہیُولیٰ تخلیق و تسویہ کے طویل مراحل طے کر کے اس قابل ہوا کہ رُوحِ آدم اس سے ملحق کی جا سکے تو نفخِ روح ہوا اور رُوح و جسد کا یہ مجموعہ مسجودِ ملائک قرار پایا۔ بفحوائے آیاتِ قرآنی:

۱۔ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ـ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِىْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ـ
(الحجر: ۲۸ - ۲۹)

اور (یاد کرو) جب کہا تیرے ربّ نے فرشتوں سے: میں پیدا کرنے والا ہوں اس سنے ہوئے گارے سے جو سوکھ کر کھنکھنانے لگا ہے ایک بشر، تو جب میں اسے پوری طرح مکمل کر چکوں اور اس میں اپنی رُوح میں سے پھونک دوں تو گر پڑنا اُس کے لیے سجدے میں۔

۲۔ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ ـ فَاِذَا

اور (یاد کرو) جب کہا تیرے رب نے فرشتوں سے: مَیں بنانے والا ہوں مٹی سے ایک

سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ
(صٓ: ۷۱، ۷۲)

بشر۔ تو جب میں اسے پوری طرح بنا کر درست کر دوں، اور پھونک دوں اس میں اپنی روح میں سے تو گر پڑنا اس کے لیے سجدے میں۔

اور پھر پوری نوعِ انسانی کو صُلبِ آدم سے متعلّق کر دیا گیا۔ چنانچہ جیسے جیسے ارحامِ اُمّہات میں افرادِ نوعِ انسانی کے اجساد تیار ہوتے رہے ایک خاص مرحلے پر جنودِ ارواح میں سے ایک ایک رُوح اُن کے ساتھ متعلّق کی جاتی رہی۔ جس کو تعبیر کیا سورۂ مومنون میں "خَلْقًا اٰخَرَ" کے الفاظِ مبارکہ سے اور جس کی خبر دی مزید وضاحت کے ساتھ صادق و مصدوق علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے۔ از رُوئے آیات و حدیث مندرجہ ذیل:

۱۔ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ ط
(السجدہ: ۷-۹)

اور اس نے انسان کی تخلیق کا آغاز کیا مٹّی سے، پھر چلائی اس کی نسل نچڑے ہوتے بے قدر پانی سے۔ پھر اس کو درست کیا پوری طرح اور پھونکا اس میں اپنی رُوح میں سے۔!

۲۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ۔ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ۔ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ق ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ط فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ

اور ہم نے پیدا کیا انسان کو مٹّی کے خلاصے سے۔ پھر کر دیا ہم نے اس کو ایک بوند جمے ہوتے ٹھکانے میں، پھر بنایا اس بوند سے ایک علقہ اور پھر بنایا اس علقہ سے ایک لوتھڑا، پھر بنائیں اس لوتھڑے سے ہڈیاں، پھر پہنایا ہڈیوں کو گوشت۔ اور پھر اٹھایا اسے ایک اور ہی اٹھان پر۔ سو بڑا ہی بابرکت ہے اللہ سب سے

الخلقین۔ (المؤمنون: ۱۲-۱۴) | اچھی تخلیق فرمانے والا۔!

۳۔ عن ابی عبد الرّحمٰن بن مسعود رضی اللہ عنہ قال حدثنا رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم و ھُوَ الصادق والمصدوق: "اِنَّ اَحَدَکُمْ یُجْمَعُ خَلْقُہٗ فِیْ بَطْنِ اُمِّہٖ اَرْبَعِیْنَ یَوْمًا نُطْفَۃً ثُمَّ یَکُوْنُ عَلَقَۃً مِّثْلَ ذٰلِکَ ثُمَّ یَکُوْنُ مُضْغَۃً مِّثْلَ ذٰلِکَ ثُمَّ یُرْسَلُ اِلَیْہِ الْمَلَکُ فَیَنْفُخُ فِیْہِ الرُّوْحَ۔ (رواہُ البخاری والمسلم)

ابو عبد الرحمٰن ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ فرمایا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سچے ہیں اور ان کی سچائی مُسَلَّم ہے کہ: "تم میں سے ہر ایک کی تخلیق رحمِ مادر میں چالیس دن تو نطفے کی صورت میں ہوتی ہے، پھر اتنے ہی دن علقہ کی صورت میں، پھر اتنے ہی دن مضغہ کی صورت میں۔ پھر اس کے بعد ایک فرشتہ بھیجا جاتا ہے جو اس میں رُوح پھونکتا ہے (اس حدیث کو روایت کیا امام بخاری اور امام مسلم دونوں نے)

واضح رہے کہ یہاں روح سے مراد زندگی لینا بہت بڑا مغالطہ ہے اِس لیے کہ بے جان تو نہ وہ 'بَیْضَۃُ الْاُنْثٰی' ہی ہوتا ہے جو طویل مسافت طے کر کے رحم میں پہنچتا ہے اور نہ 'نُطْفَۃُ الرَّجُل' جو نہایت جوش و خروش سے حرکت کرتے ہوئے پوری قوّت کے ساتھ اس میں داخل ہوتا ہے۔ رہے علقہ اور مضغہ تو اُن میں تو نشوونما کا خالص حیاتیاتی عمل انتہائی زور شور سے جاری ہوتا ہے۔ لہٰذا یہاں بے جان مادّے میں زندگی پھونکنے کا کوئی سوال نہیں بلکہ جسدِ انسانی کے ساتھ جو تخلیق و تسویہ کے مراحل طے کر رہا ہے روحِ انسانی کے الحاق کا معاملہ ہے، فافھم وتدبّر!

اب آیئے اصل موضوع کی طرف!

حقیقت یہ ہے کہ انسان ایک مرکّب وجود کا حامل ہے جو دو اجزاء پر مشتمل ہے:
ایک[1] اس کا وجودِ حیوانی جو مجموعہ ہے جسم اور جان یا جسد و حیات دونوں کا اور دوسرے[2] روحِ انسانی جس کے شرف و مجد کے اظہار کے لیے اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی ذات کی طرف نسبت دی! (وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ!) ایک[1] کا تعلق ہے عالمِ خلق سے جس میں تخلیق و تسویہ کا عمل لازماً تدریج و ارتقاء کے مراحل سے ہو کر گزرتا ہے جب کہ دوسرے[2] کا تعلق ہے عالمِ امر سے جہاں ابداع اور ایجاد و تکوین کا ظہور کُن فیکونی شان کے ساتھ ہوتا ہے بفحوائے الفاظِ قرآنی:

۱۔ وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ط قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ۔ (بنی اسرائیل: ۸۵)	اور وہ پوچھتے ہیں تم سے روح کے بارے میں۔ کہو روح میرے رب کے امر سے ہے!
۲۔ وَمَا اَمْرُنَا اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ (القمر: ۵۰)	اور نہیں ہے ہمارا امر مگر بس ایسے جیسے ایک لپک نگاہ کی۔!
۳۔ اِنَّمَا اَمْرُهٗ اِذَا اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ۔ (یٰسٓ: ۸۲)	اور اس کے امر کی شان تو یہ ہے کہ وہ بس کہہ دیتا ہے کہ ہو جا اور ہو جاتا ہے!

مزید برآں ـــــ ایک کا رُجحان ہے عالمِ سفلی کی طرف جبکہ دوسرے کی پرواز ہے عالمِ علوی کی جانب بلکہ ایک بالقوہ "اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ[2]" کے حکم میں ہے تو دوسرے کا اصل مقام اعلیٰ "علیّین[3]" میں ہے، ایک خاکی الاصل ہے اور "كُلُّ شَيْءٍ يَرْجِعُ اِلٰی

---

[1] اکثر لوگ روح کو حیات یا زندگی کے ساتھ خلط ملط کر دیتے ہیں حالانکہ زندگی تو جمیع حیوانات ہی نہیں نباتات تک میں ہے۔ وہ روحِ ربّانی جس سے انسان جملہ حیوانات سے ممیز ہوتا ہے بالکل دوسری چیز ہے!

[2] سورۃ والتین [3] سورۂ مطففین۔

اَصْلِہٖ" کے مصداق "وَلٰکِنَّہٗ اَخْلَدَ اِلَی الْاَرْضِ" [2] کی مکمل تصویر جبکہ دوسرا نوری الاصل اور
ع : " اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حُسن!" کے مصداق ہمیشہ عالمِ بالا کی جانب مائل و متوجّہ ۔
ایک خالصتہً حیوانات کی سطح پر ہے تو دوسرا فرشتوں کا ہم رُتبہ ہی نہیں بالقوّہ اُن سے
بھی آگے بقولِ شیخ سعدیؒ ؎

آدمی زادہ طُرفہ معجون است ۔۔۔ از فرشتہ سرشتہ وز حیواں

گویا دونوں باہم متضاد و متصادم ہیں۔ چنانچہ ایک تقویّت پاتا ہے تو دوسرا لازماً مضمحل ہوتا ہے اور ایک کا دباؤ بڑھے تو دوسرے کا کُچلا جانا لازمی ہے! چنانچہ بطن و فرج کے تقاضوں کی بھرپور تسکین اور کثرتِ آرام و استراحت سے رُوح مضمحل ہوتی چلی جاتی ہے، حتیٰ کہ وہ وقت بھی آجاتا ہے جب انسان کا جسدِ خاکی چلتا پھرتا اور کھاتا پیتا الغرض ہر اعتبار سے زندہ ہی نہیں خُوب فربہ و توانا نظر آتا ہے درانحالیکہ اس کی رُوح، کمزور اور لاغر ہوتی ہوتی بالآخر سِسک سِسک کر دم توڑ دیتی ہے اور جسدِ انسانی اس رُوح کے لیے چلتی پھرتی قبر بن کر رہ جاتا ہے بقول علامہ اقبال ؎ ع " روح سے تھا زندگی میں بھی تہی جن کا جسد!"

اور بفحوائے الفاظِ قرآنی :

اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ ۔۔۔ یقیناً (اے نبی) تم نہیں سنا سکتے (اپنی بات) مُردوں کو اور نہ سُنا سکتے ہو

---

[1] ایک مقولہ : ہر شے اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے! [2] سورہ اعراف : ۱۷۶

[3] قرآنِ حکیم نے ایک سے زائد مقامات پر منافقین کے 'تن و توش' کی جانب خصوصی اشارے کیے ہیں مثلاً

سورہ منافقون میں فرمایا :

وَاِذَا رَاَیْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ ۚ وَاِنْ یَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ؕ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ؕ (سورہ منافقون : ۴) ۔۔۔ اور (اے نبی) جب تم انہیں (منافقین کو) دیکھتے ہو تو اُن کے تن و توش سے متاثر ہو جاتے ہو۔ چنانچہ جب وہ بات کرتے ہیں تو اُن کی گفتگو کو بغور سنتے ہو حالانکہ درحقیقت وہ سوکھی لکڑیوں کے مانند ہیں جنہیں سہارے سے رکھ دیا گیا ہو۔

(النحل : ۸۰ ، الرّوم : ۵۲) (اپنا پیغام بہروں کو!)

افسوس کہ دورِ حاضر میں مادّہ پرستانہ نقطۂ نظر کے تسلط کے باعث رُوح اور جسد کے جُداگانہ تشخّص اور اُن کے تقاضوں کے باہم متضاد و متصادم ہونے کا شعور و ادراک عوام تو کجا خواص تک کو حاصل نہیں رہا حتّٰی کہ بہت سے جدید 'مفکرینِ اسلام' تو اِس حقیقتِ کبریٰ کا ذکر بھی بطرزِ استہزاء و استحقار کرتے ہیں۔ چنانچہ عصرِ حاضر کے ایک بہت بڑے 'مفکرِ اسلام'[1] "اسلام کا روحانی نظام" کے عنوان سے ایک نشری تقریر میں فرماتے ہیں:

"فلسفہ و مذہب کی دنیا میں عام طور پر جو تخیل کارفرما ہے وہ یہ ہے کہ روح اور جسم ایک دوسرے کی ضد ہیں، دونوں کا عالم جدا ہے۔ دونوں کے تقاضے الگ بلکہ باہم مخالف ہیں۔۔۔۔ اسلام کا نقطۂ نظر اس معاملے میں دنیا کے تمام مذہبی اور فلسفیانہ نظاموں سے مختلف ہے۔۔۔۔"

اِس ضمن میں انہوں نے 'دنیا پرستی' اور 'ترکِ دنیا' کی دو انتہائی صورتوں کی جو تردید کی ہے وہ اصولاً بالکل درست ہے لیکن حیرت ہوتی ہے کہ اُن کی توجہ اِس حقیقت کی جانب کیوں منعطف نہ ہوئی کہ انسانی تاریخ میں ان دونوں انتہاؤں کی موجودگی بجائے خود اِس کا ثبوت ہے کہ انسانی شخصیت میں دو بالکل متضاد اور مخالف قوّتیں کارفرما ہیں۔ جن کے مابین مسلسل رسّہ کشی جاری رہتی ہے۔ چنانچہ کبھی ایک پلڑا بھاری ہو جاتا ہے کبھی دوسری کا۔ بقول علّامہ اقبالؒ ؎

اِسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رُومی کبھی پیچ و تابِ رازی

اسلام بلاشبہ ان کے مابین توازن پیدا کرنا چاہتا ہے اور عدمِ توازن[2] کو ہرگز

---

[1] مولانا سیّد ابو الاعلیٰ مودودی مرحوم [2] حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں

پسند نہیں کرتا لیکن توازن کا یہ تصور بجائے خود دلیل قاطع ہے جسد اور روح کے تضاد اور ان کے تقاضوں کے باہم متقابل و متباین ہونے کی۔ بقول شاعر ؎

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہ ای !
بازمی گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش !

واقعہ یہ ہے کہ فکر و نظر کی اس بنیادی غلطی نے تصور دین کی پوری عمارت ہی کو کج کر ڈالا ہے۔ چنانچہ جب 'روح' صرف زندگی کے ہم معنیٰ ہو کر رہ گئی تو 'دین' بھی بس ایک 'نظام حیات' بن کر رہ گیا اور مذہب کا ایک ایسا لامذہبی (SECULAR) ایڈیشن تیار ہو گیا جس میں مذہب کے لطیف حقائق سرے سے خارج از بحث ہو گئے ؎

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج ! تا ثریّا می رود دیوار کج !!

ایک حقیقت کی جانب مزید توجہ فرما لیجئے !

جسدِ انسانی یا انسان کا وجودِ حیوانی خاکی الاصل ہے چنانچہ اس کی جملہ ضرورتیں اور اس کے تغذیہ و تقویت کا تمام سامان بھی زمین ہی سے حاصل ہوتا ہے جبکہ روحِ انسانی قدسی الاصل اور "امرِ ربّ" ہے لہٰذا اس کے تغذیہ و تقویت کی ضرورت بھی تمام تر کلامِ ربّانی ہی

(حاشیہ صفحہ سابقہ) اگرچہ عدمِ توازن کی تمام صورتیں برابر نہیں ہیں۔ چنانچہ بہت فرق ہے اس عدمِ توازن میں جو دنیا پرستی یا شکم پروری و شہوت پرستی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور اس عدمِ توازن میں جو ترکِ دنیا یا رہبانیت کی صورت اختیار کرتا ہے۔ سابقہ اُمتوں میں عدمِ توازن کی پہلی صورت کی مثال یہود ہیں جنہیں "المغضوب علیہم" قرار دیا گیا ہے اور دوسری صورت کی مثال نصاریٰ ہیں جنہیں صرف "ضالّین" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مزید تقابل کے لیے دیکھیے سورۂ حدید جس کے وسط میں یہود کا ذکر ہے جن کی دنیا پرستی نتیجہ تھی 'قساوتِ قلبی' کا اور آخر میں متبعین عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے جن کی رہبانیت کو اگرچہ بدعت قرار دیا گیا لیکن اس تصریح کے ساتھ کہ تھی یہ نیکی کے جذبے ہی کی ایک غیر معتدل صورت !

سے پوری ہوسکتی ہے جسے قرآن حکیم نے روح[1] ہی سے تعبیر کیا ہے از روئے آیاتِ مبارکہ:

۱۔ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا	اور اسی طرح (اے نبی) ہم نے وحی کی
مِّنْ اَمْرِنَا ۚ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ	تمہیں ایک رُوح اپنے امر سے (اس سے
وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ	پہلے تم کچھ نہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور
نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ	ایمان کیا لیکن (اب) بنا دیا ہے اسے ایک
مِنْ عِبَادِنَا ۔	نُور جس کے ذریعے ہدایت دیتے ہیں ہم
(الشوریٰ : ۵۲)	اپنے بندوں میں سے جس کو چاہیں!
۲۔ يُلْقِي الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ	القاء فرماتا ہے روح اپنے امر سے اپنے
يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ (المومن : ۱۵)	بندوں میں سے جس پر چاہے!
۳۔ يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ	نازل فرماتا ہے فرشتوں کو وحی
مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ	کے ساتھ اپنے امر سے، اپنے بندوں
عِبَادِهٖ ۔ (النحل : ۲)	میں سے جس پر چاہے!

اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ رمضان المبارک کے پروگرام کی دو شقیں ہیں ایک دن کا روزہ اور دوسرے رات کا قیام اور اس میں قرأت و استماعِ قرآن! اور اگرچہ ان میں سے پہلی شق فرض کے درجے میں ہے اور دوسری بظاہر نفل کے، تاہم قرآن مجید اور احادیثِ نبویہ

---

[1] یہاں اس حقیقت کی جانب بھی توجہ ہو جائے کہ وحی کے لانے والے کو بھی قرآن نے کہیں "رُوحُ القُدس" سے موسوم فرمایا ہے اور کہیں "الرُّوحُ الامین" سے اور مہبطِ وحی بھی قرار دیا ہے قلب کو جو در اصل بمنزلہ شاہ درہ ہے شہرِ رُوح کے لیے۔ تو حقیقتِ وحی کے ضمن میں بھی ایک کلید مل جاتی ہے اگرچہ یہ بجائے خود ایک مستقل موضوع ہے! گویا وحی خود بھی روح، اس کے لانے والا بھی روح اور اس کا مہبط بھی روح۔ جگر کا ایک شعر اس نغمۂ وحی کی ماہیت کو خوب واضح کرتا ہے ؂

نغمہ وہی ہے نغمہ کہ جس کو　　رُوح سُنے اور روح سُنائے!

علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام دونوں نے اشارۃً اور کنایۃً واضح فرمادیا کہ یہ ہے رمضان المبارک کے پروگرام کا جزوِ لاینفک! چنانچہ قرآن نے وضاحت فرمادی کہ روزوں کے لیے ماہِ رمضان معیّن ہی اس لیے کیا گیا ہے کہ اس میں قرآن مجید نازل ہوا تھا: گویا یہ ہے ہی نزولِ قرآن کا سالانہ جشن!

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ۔ (البقرۃ: ۱۸۵)

رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن مجید نازل ہوا۔

اور احادیث نے تو بالکل ہی واضح کر دیا کہ رمضان المبارک میں 'صیام' اور 'قیام' لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں، چنانچہ:-

۱- امام بیہقیؒ نے رمضان المبارک کی فضیلت کے ضمن میں جو خطبہ آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلم کا 'شعب الایمان' میں نقل کیا ہے، اُس کے الفاظ ہیں:

جَعَلَ اللّٰهُ صِیَامَهٗ فَرِیْضَةً وَقِیَامَ لَیْلِهٖ تَطَوُّعًا۔

اللہ نے قرار دیا اس میں روزہ رکھنا فرض اور اُس کا قیام اپنی مرضی پر۔

گویا قیام اللیل اگرچہ "تَطَوُّعًا" ہے تاہم اللہ کی جانب سے 'مجعول' بہرحال ہے!

۲- بخاریؒ اور مسلمؒ دونوں نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَّ احْتِسَابًا غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ وَمَنْ قَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَّ احْتِسَابًا غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ ط

جس نے روزے رکھے رمضان میں ایمان و احتساب کے ساتھ بخش دیئے گئے اس کے تمام سابقہ گناہ۔ اور جس نے (راتوں کو) قیام کیا رمضان میں ایمان و احتساب کے ساتھ بخش دیئے گئے اُس کے جملہ سابقہ گناہ۔

۳- امام بیہقیؒ نے 'شعب الایمان' میں حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن العاصؓ سے روایت

کیا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

اَلصِّیَامُ وَالْقُرْاٰنُ یَشْفَعَانِ	روزہ اور قرآن بندۂ مومن کے حق
لِلْعَبْدِ یَقُوْلُ الصِّیَامُ	میں سفارش کریں گے روزہ کہے گا
اَیْ رَبِّ اِنِّیْ مَنَعْتُہُ الطَّعَامَ	اے رب! میں نے اسے روکے رکھا
وَالشَّھَوَاتِ بِالنَّھَارِ	دن میں کھانے اور خواہشات سے پس اس
فَشَفِّعْنِیْ فِیْہِ وَیَقُوْلُ	کے حق میں میری سفارش قبول فرما اور قرآن
اَلْقُرْاٰنُ مَنَعْتُہُ النَّوْمَ	کہے گا میں نے روکے رکھا اسے رات کو
بِاللَّیْلِ فَشَفِّعْنِیْ فِیْہِ	نیند سے پس اس کے حق میں میری سفارش
فَیُشَفَّعَانِ۔ ط	قبول فرما۔ تو دونوں کی سفارش قبول کی جائیگی

اور اب غور فرمائیے صوم رمضان کی حکمتوں پر!

حقائق متذکرہ بالا کے پیش نظر صیام و قیامِ رمضان کی اصلی غایت وحکمت اور ان کا اصل ہدف ومقصود ایک جملے میں اس طرح سمویا جا سکتا ہے کہ: —— ایک طرف روزہ انسان کے جسدِ حیوانی کے ضعف واضمحلال کا سبب بنے تاکہ رُوحِ انسانی کے پاؤں میں پڑی ہوئی بیڑیاں کچھ ہلکی ہوں اور بہیمیت کے بھاری بوجھ تلے دبی ہوئی اور سسکتی اور کراہتی ہوئی رُوح کو سانس لینے کا موقع ملے —— اور دوسری طرف قیامُ اللیل میں کلامِ ربّانی کا رُوح پرور نزول[1] اُس کے تغذیہ وتقویّت کا سبب بنے —— تاکہ ایک جانب اس پر کلامِ الٰہی کی عظمت کما حقّہٗ منکشف ہو جائے اور وہ اچھی طرح محسوس کرلے کہ یہی اُس کی بھوک کو سیری اور پیاس کو آسودگی عطا کرنے کا ذریعہ اور اُس کے دُکھ کا علاج اور درد کا درماں

---

[1] تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کُشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشّاف! (اقبالؔ)

ہے! ـــــ اور دوسری جانب رُوحِ انسانی ازسرِنوقوی اور توانا ہوکر" اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز" ہو گویا اس میں تقرّب الی اللہ کا داعیہ شدّت سے بیدار ہو جائے اور وہ مشغولِ دعا و مناجات ہو جو اصل رُوح ہے عبادت[۱] کی اور لُبِّ لُباب ہے رُشد و ہدایت کا!

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں صوم و رمضان سے متعلق آیات[۲] میں:

اولاً ـــــ مجرّد صوم کی مشروعیّت اور اُس کے ابتدائی احکام کا ذکر ہوا اور اُس کی غرض و غایت بیان ہوئی "لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ" کے الفاظ میں اور

ثانیاً ـــــ صومِ رمضان کی فرضیّت اور اُس کے تکمیلی احکام کا بیان ہوا اور اُس کے ثمرات و نتائج کا ذکر ہوا دو طرح پر:

ایک ـــــ "وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ" کے الفاظ میں جو عبارت ہے انکشافِ عظمتِ نعمتِ قرآن اور اُس پر اللہ کی جناب میں ہدیۂ تکبیر و تشکّر پیش کرنے سے ـــــ اور

دوسرے ـــــ "وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ط اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ . . . لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ" کے الفاظ میں جو عبارت ہے انسان کے متوجّہ الی اللہ و مُتلاشیِ قربِ الٰہی اور مشغولِ دُعا اور محوِ مناجات ہونے سے جو اصل حاصل ہے عبادتِ رَبّ کا!

الغرض! صیام و قیامِ رمضان کا اصل مقصود یہ ہے کہ رُوحِ انسانی بہیمیت کے غلبے اور تسلّط سے نجات پاکر گویا حیاتِ تازہ حاصل کرے اور پوری شدّت و قوّت اور کمالِ ذوق و شوق کے ساتھ اپنے رَبّ کی جانب متوجہ ہو جائے!

---

[۱] احادیثِ نبویہ علی صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام: "اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ" اور "اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ"

[۲] سورۂ بقرہ آیات ۱۸۳ تا ۱۸۷

اب ذرا ایک بار پھر سوچیے کہ یہ 'روحِ انسانی' درحقیقت ہے کیا ؟ جیسے کہ پہلے واضح ہو چکا ہے، یہ " اَمْرِ رَبِّیْ " بھی ہے اور جلوۂ ربّانی بھی۔ اِس کا تعلّق ذاتِ خداوندی کے ساتھ بالکل وہی ہے جو سورج کی ایک کرن کا سورج کے ساتھ کہ لاکھوں اور کروڑوں میل دُور آجانے کے باوجود اپنے منبع سے منقطع اور اپنے جُداگانہ وجود کے باوصف اپنی اصل سے منفصل نہیں ہے ——— بعینہٖ یہی کیفیت ہے رُوحِ انسانی کی کہ اپنے علیحدہ تشخّص کے باوجود خدا سے منفصل نہیں بلکہ متّصل ہے بقولِ عارفِ رومیؒ ؎

اتّصالے بے تکیّف بے قیاس

ہست رَبُّ النّاس را با جانِ ناس !

گویا قلبِ انسانی کی مکین روحِ ربّانی براہِ راست متّصل ہے ذاتِ ربّ کے ساتھ اور یہی ہے وہ عظیم امانت جس کے بارِ گراں کے نہ سماوات متحمّل ہو سکے نہ ارض و جبال لیکن جو حصّے میں آئی ظلوم و جہول انسانؔ کے : ؎

آسماں بارِ امانت نتواں گشت کشید

قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند !

یہی وجہ ہے کہ ایک حدیثِ قدسی کی رُو سے قلبِ مومن کی مکین خود ذاتِ الٰہی ہے :

مَا وَسِعَنِیْ اَرْضِیْ وَلَا سَمَائِیْ	میں نہ زمین میں سما سکا نہ آسمان میں ،
وَلٰکِنْ وَسِعَنِیْ قَلْبُ عَبْدِی الْمُؤمِنِ	البتہ اپنے مومن بندے کے دل
(احیاء علوم الدین، امام غزالیؒ ج ۳ ص ۱۴)	میں میری سمائی ہو گئی ۔!

؎ من نگنجم در زمین و آسماں لیک گنجم در دلِ مومن عیاں ! (سعدیؔ)

تو کیا بالکل درست نہیں یہ قولِ مبارک کہ " اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ " ——— بلکہ اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اُجْزٰی بِہٖ " ——— اِس لیے جب کہ دوسری بدنی اور مالی عبادتوں

لہ سورۂ احزاب آیت : ۷۲

کا حاصل ہے تزکیہ و تطہیرِ نفس وہاں صومِ رمضان کا حاصل ہے تغذیہ و تقویتِ رُوح جو متعلّق ہے براہِ راست ذاتِ خداوندی کے ساتھ —— لہٰذا روزہ ہوا خاص اللہ کے لیئے اب چاہے یوں کہہ لیں کہ وہ خود ہی اس کی جزا دے گا یا یوں کہہ لیں کہ وہ خود تعالیٰ ہی بہ نفس نفیس اس کا انعام ہے، کوئی فرق واقع نہیں ہوتا اس لیے کہ خدا تو منتظر رہتا ہے کہ جیسے ہی کوئی بندہ خلوص و اخلاص کے ساتھ اس کی طرف متوجّہ ہو وہ بھی کمالِ شفقت و عنایت کے ساتھ اس کی طرف متوجّہ ہو جائے —— یہاں تک کہ ایک حدیثِ قدسی کی رُو سے اگر بندہ اُس کی جانب چل کر آتا ہے تو وہ تعالیٰ بندے کی جانب دوڑ کر آتا ہے اور اگر بندہ اُس کی طرف بالشت بھر بڑھتا ہے تو وہ تعالیٰ بندے کی طرف ہاتھ بھر بڑھتا ہے —— گویا بقول علّامہ اقبال مرحوم ؎

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں !
راہ دکھلائیں کسے ؟ رَہروِ منزل ہی نہیں !

ڈاکٹر اسرار احمد

نے اپنی دوسری دینی اور علمی خدمات کیساتھ ساتھ شادی بیاہ کی تقریبات کے ضمن میں

ایک اصلاحی تحریک

بھی برپا کی اور —— خطبۂ نکاح —— کو صرف ایک رسم

کی بجائے واقعی تذکیر و نصیحت اور معاشرتی زندگی سے متعلق اسلامی تعلیمات کو عام کرنے کا ذریعہ بنایا

اِس موضوع پر ڈاکٹر صاحب کی ایک اہم تحریر اور ایک خطبۂ نکاح کو دیدہ زیب کتاب کی صورت میں شائع کر دیا گیا ہے۔

بڑے سائز کے ۴۸ صفحات ○ عمدہ دبیز کاغذ ○ دیدہ زیب کور ،

ہدیہ : ۴ روپے —— محصول ڈاک علاوہ